انوار احمد کے افسانوں میں سیاسی و سماجی شعور

[1] رضوان فیصل

Abstract:

Anwaar Ahmad is a famous short story writer as well as a fiction critic. If we study the themes of his fictions, we find that most of his fictions are about the tyranny of martial law, social tyranny, oppression and exploitation of the individual, class division, restriction on freedom of speech and unfavourable situation. Written on resistance. Anwaar Ahmed is familiar with the whole sixteen embellishments of the story. They tell the story in a way that communicates to the reader. Anwaar Ahmed is in fact a man of pain, so whenever any form of exploitation is adopted at the local, social, economic, religious, national or international level. So, Anwar Ahmed's pen starts moving.

Keywords: **Urdu Fiction, Urdu Short Story, Afsana, Multan, Fiction Writer, Political Study, Social Study.**

کلیدی الفاظ: اردو فکشن، اردو افسانہ، انوار احمد، ملتان، افسانہ نگار، سیاسی شعور، سماجی شعور

انوار احمد کا شمار ان افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے جنھوں نے اپنے مخصوص طرزِ فکر اور تیکھے اسلوب کے باعث جلد ہی افسانہ نگاروں کے ہجوم میں انفرادیت قائم کر لی۔ انوار احمد اور افسانہ لازم و ملزوم ہیں۔ اُنھوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ افسانہ پڑھنے، لکھنے اور اس کے بارے میں سوچنے میں صَرف کیا۔ وہ بات کرنے اور کہانی سنانے کا ہنر جانتے ہیں۔ 'وہ گرد و پیش کے حالات و واقعات پر گہری نظر رکھتے ہیں اور سیاسی اور سماجی شعور کو اپنے افسانوں کا حصہ بناتے ہیں۔'(۱) انوار احمد نے افسانے لکھنے کا آغاز زمانہ طالب علمی سے کیا۔ ان کی اولین کہانی کا عنوان ''کتب خانے میں لاش'' ہے۔ انوار احمد کے تین افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے افسانوں کا اولین مجموعہ ''ایک ہی کہانی'' کے عنوان سے سنگِ میل پبلی کیشنز نے ۱۹۹۶ء میں شائع کیا۔ ''ایک ہی کہانی'' کے بعد

---

[1] استاد، شعبہ اردو، گورنمنٹ ولایت حسین اسلامیہ کالج ملتان

انوار احمد کا دوسرا افسانوی مجموعہ ''پہلے سے سنی ہوئی کہانی'' کے عنوان سے ۲۰۰۳ء میں بیکن بکس ملتان سے شائع ہوا۔ انوار احمد کے اولین افسانوی مجموعے ''ایک ہی کہانی'' اور ''اور پہلے سے سنی ہوئی کہانی'' میں محض ایک ہی افسانے کا فرق ہے۔ اس کے علاوہ باقی تمام افسانے دونوں مجموعوں میں مشترک ہیں۔ اب یہاں پر ایک اہم سوال یہ جنم لیتا ہے کہ اگر دونوں مجموعوں میں محض ایک کہانی کا فرق تھا تو پھر دوسری کتاب کو ایک نئے نام سے کیوں شائع کیا؟ اس حوالے سے انوار احمد لکھتے ہیں:

> ''جب میں (ترکی سے) واپس آیا تو میں نے دیکھا کہ سنگِ میل کے ذریعے وہ اس طرح سے لوگوں تک پہنچا نہیں ہے تو پھر میں نے کچھ اضافے کر کے اسے بیکن بکس ملتان سے چھپوا دیا۔''(۲)

اگر دونوں افسانوی مجموعوں کا تقابلی جائزہ لیا جائے تو محض دو جگہ پر تضاد ہے۔ پہلے افسانوی مجموعے میں شامل افسانہ ''کہانی اور کہر'' دوسرے افسانوی مجموعے میں شامل نہیں ہے بلکہ اس کی جگہ جو کہانی شامل کی گئی ہے اس کا عنوان ''یرغمالی'' ہے اور پہلے افسانوی مجموعے میں شامل افسانے ''دعا کی لاش'' کے عنوان میں تھوڑی سی ترمیم کر کے ''دعا کی تلاش'' کر دیا گیا ہے۔

۲۰۱۰ء میں انوار احمد کا تیسرا اور تاحال آخری افسانوی مجموعہ منظر عام پر آیا جس کا عنوان ''آخری خط'' ہے۔ اس افسانوی مجموعے میں کل ۲۸ افسانے شامل ہیں ان میں سے ۱۶ افسانے ابتدائی دو مجموعوں سے لیے گئے ہیں جب کہ چودہ افسانے پہلی مرتبہ منظر عام پر آئے ہیں۔ ''آخری خط'' میں انوار احمد نے تین کہانیوں کے عنوانات میں ترمیم کی ہے ''قومی مفاد میں مرتب کی جانے والی رپورٹ'' کے طویل عنوان کو مختصر کر کے ''ناقابلِ اشاعت'' کر دیا ہے۔ ''پہلا محبِ وطن بچہ'' کے نام میں تھوڑا اضافہ کر کے ''شہر کا پہلا محبِ وطن بچہ'' رکھا ہے اور ''شہید کا خواب'' کا عنوان ''کمال بستی، جبڑا چوک'' کر دیا گیا ہے۔ انوار احمد کا یہ مجموعہ قدیم اور جدید افسانوں کا امتزاج ہے۔

انوار احمد بنیادی طور پر ترقی پسند ہیں۔ان کے بیشتر افسانے مارشل لا کے ظلم واستبداد، سماجی کرختگی، جبر اور استحصال، طبقاتی تقسیم، آزادی رائے پر پابندی اور ناموافق صورتحال میں فرد کی مزاحمت پر لکھے گئے ہیں۔ انوار احمد کہانی کے سولہ سنگاروں سے واقف ہیں۔ وہ قاری کے سامنے اس انداز سے کہانی بیان کرتے ہیں جس سے ابلاغ ہو جائے۔انوار احمد در حقیقت درد مند انسان ہیں اس لیے جب بھی مقامی، سماجی، معاشی، مذہبی، قومی یا بین الاقوامی سطح پر استحصال کی کوئی بھی صورت اختیار کی جاتی ہے۔ تو انوار احمد کا قلم حرکت میں آجاتا ہے۔ڈاکٹر اے۔بی اشرف لکھتے ہیں:

> ''انوار احمد کے پاس ایک درد مند دل اور کہانی کا آدرش ہے۔وہ کسی صورت میں، کسی سطح پر ظلم واستحصال کو برداشت نہیں کر سکتا اس کی سائیکی فوری طور پر مجروح ہوتی ہے۔''(۳)

انوار احمد بے باک افسانہ نگار ہیں۔ وہ اپنی تخلیقات میں ایسے موضوعات پیش کرتے ہیں جن پر عام طور پر بات کرنا ہمارے معاشرے میں اخلاقیات کے منافی سمجھا جاتا ہے۔ لیکن کسی بھی بڑے فنکار کی طرح انوار احمد بے حوصلہ نہیں ہوتا بلکہ ان کے افسانوں میں امید کا دیا ہمیشہ روشن رہتا ہے۔ وہ بد سے بد ترین حالات میں بھی مزاحمت کا درس دیتا ہے۔ وہ چلتا ہے، گرتا ہے، پھر اٹھتا ہے پھر چلتا ہے پھر ٹھوکر لگتی ہے پھر گرتا ہے مگر دگرگوں حالت کو جیتنے نہیں دیتا، خود کو مقابلے پر اکساتا ہے اور اس مزاحمت کا درس ان کے افسانوں میں واضح طور پر نظر آتا ہے۔انوار احمد اپنے افسانوں میں سماج میں جبر اور استحصال کی کسی بھی طاقت کے آگے ڈٹ جانے کا درس دیتے ہیں۔ وہ کوشش، عمل اور حرکت کا درس دیتے ہیں۔انوار احمد کا مدعا نامساعد حالات کے آگے جدوجہد کرنا ہے۔ وہ عصری تقاضوں سے بھی بے خبر نہیں ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ جس سماج کے قاری سے وہ مخاطب ہیں وہاں دانشور چند ٹکوں کے عوض اپنا دماغ، صحافی چند روپے کے لیے اپنا قلم اور ملا چند آسائشات کے لیے نہ صرف مذہب کو فروخت کر دیتے ہیں بلکہ آنے والی نسلوں کے لیے گمراہی کا سامان بھی کر جاتے ہیں۔ مگر جو درس انوار احمد کا ہے وہ کوشش ہے، کوشش کر کے ہارنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ان کے افسانے ''ایک ہی کہانی'' کا اقتباس دیکھیے جس میں مزاحمت کی کوشش نمایاں طور پر سامنے آتی ہے:

''اس نے اپنا پورا زور لگا کر آنکھیں کھولیں اور اپنے چاروں طرف نگاہ ڈالی۔ طوفان کی سانس اکھڑ چکی تھی اور سمندر سہم کر اسے تکے جا رہا تھا۔ سمند کے عین سینے میں پیوست ہونے سے پہلے اس نے اپنے ان ساتھیوں کے بارے میں سوچا، ساحل پر جن کی خند قیں قبریں بن چکی تھیں۔''(۴)

انوار احمد کے افسانے سیاسی شعور و بصیرت کے حامل ہیں۔ انوار احمد کے افسانوں کا بڑا موضوع مارشل لاء اس کے بعد پیدا ہونے والے حالات و واقعات، فرد کی آزادی رائے سلب کرنے والی طاقتیں، بنیادی انسانی حقوق سے محرومی اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والا ایک ایسا معاشرہ ہے جس میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت مفقود ہے۔ انوار احمد کے افسانوی سفر کا آغاز ۱۹۷۱ء میں ہوا۔ جولائی ۱۹۷۷ء میں ضیاء الحق کی بدترین آمریت اس ملک کا نصیب بنی۔ اظہار رائے کی آزادی ختم کر دی گئی۔ پریس پر پابندیاں لگ گئیں۔ بائیں بازو کے لکھاری خاص کر زیرِ عتاب ٹھہرے۔ چناں چہ ان کی تحریروں پر اس صورتحال کا گہرا اثر ہوا اور علامتی اسلوب ان کے افسانوں میں در آیا۔ انوار احمد کے افسانوں میں مارشل لاء کے حالات کو واضح طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے:

''کہنے کو تو شہر بہت سے معاملات میں خود کفیل تھا۔ کھیس دری سے لے کر عصمت دری تک، اخبار، ریڈیوں سے لے کر چرس افیون تک، ادیبوں، شاعروں سے لے کر خون بیچنے والوں تک، تعلیمی اکھاڑوں تک، تفریح گاہوں سے قبرستانوں تک اور سورج طلوع کرنے والی کوٹھیوں سے لے کر شعاع کو ترسنے والی گلیوں تک، مگر اسے یوں محسوس ہوتا جیسے ہر چیز میں سے اصل چیز نکل گئی ہو۔ بدن، روح کو اور مکان، مکیں کو ترستے ہوئے۔''(۵)

اگرچہ مارشل لا کا ذکر ایسا موضوع ہے کہ جس پر انوار احمد بھڑک اٹھتے ہیں۔ اُنھیں اس تاریک دور کے نقصانات کا ادراک ہے مگر انوار احمد کے ہاں توازن اس انداز سے موجود ہے کہ فنی جہت کسی طور بھی متاثر نہیں ہوتی۔ وہ مولوی نذیر احمد کی طرح لمبی لمبی تقریریں کر کے ادب کو کرافٹنگ کے اعتبار سے مجروح نہیں کرتے بلکہ اپنے اندر کے بپھرے ہوئے انسان پہ قابو پا کر شائستگی اور سنجیدگی سے اپنی آرا کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ فکر اور فن کا حسین امتزاج ہمارے روبرو ہوتا ہے۔ اصغر ندیم سید کی رائے ملاحظہ کیجئے:

''وہ احتجاج کے لہجے میں بھی فنی تقاضوں کو اولیت دیتا ہے۔ حالاں کہ اس کی خواہش ہوتی ہے کہ احتجاج اتنا بھرپور ہو کہ دشمن کی کمر توڑ دے لیکن اس طرح وہ اپنے کرافٹ کی باریکیوں اور پہلوؤں کو ضائع کر کے مقصد حاصل کرنے کو ترجیح نہیں دیتا۔''(۶)

عام طور پر افسانہ نگار اپنے افسانوی سفر کا آغاز رومانوی افسانوں سے کرتے ہیں اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کا تخلیقی شعور پختگی کی جانب مائل ہو جاتا ہے اور وہ سماجی مسائل کو اپنے افسانوں کا موضوع بناتے ہیں لیکن انوار احمد نے اپنی افسانوی دور کے آغاز میں ہی ایسا شاندار افسانہ لکھ ڈالا کہ وقت گزرنے کے ساتھ بھی اس کی رعنائی ماند نہیں پڑی۔ انوار احمد اپنا آخری سٹروک ہمیشہ سنبھال کر رکھتے ہیں۔ ''نوں جی'' کا اختتام بڑے ڈرامائی انداز میں ہوتا ہے:

''بس جی اس نے ایک جھلنگی چارپائی پر لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں اور لمے لمے ہو کے بھرنے لگی، موتیاں والیاں ! میں تو وہ کپڑے اٹھائے اور وہاں سے دوڑ لگائی۔ بے ساختہ میرے منہ سے نکلا، لعنت ہو تم پر خدا کی، بلکہ پوری ملتِ اسلامیہ کی، وہ کہنے لگا باؤ جی میرے گھر کھان والے نوں جی ہیں۔''(۷)

اس افسانے کا ڈرامائی اختتام ہمیں منٹو کی یاد دلاتا ہے۔ اس افسانے کے موضوع کو دیکھا جائے تو وہ بھی ہمیں منٹو کے موضوعات کے قریب دکھائی دیتا ہے۔ ایک ایسا انسان کہ جس کے گھر غربت ہو، معاشی تنگدستی ہو تو اُسے کوئی دوشیزہ ایسی رعایت بھی دے تو اس کے لیے اس موقعے سے فائدہ اٹھانے سے بہتر انتخاب یہ ہے کہ وہ اس کے کپڑے اٹھا کر لے جائے اور ان سے معاشی ضروریات پوری کرے۔ قاری اس وقت شدید حیرت کا شکار ہو جاتا ہے جب وہ اپنے بدن کو راحت پہنچانے کا موقع گنوا کر دوشیزہ کے کپڑے اٹھا بھاگ جاتا ہے مگر انوار احمد قاری کو زیادہ دیر تک پریشان نہیں کرتے اور فوراً اس عمل کی وجہ بیان کرتے ہیں کہ میرے گھر کھانے والے نو افراد ہیں۔ ڈاکٹر روبینہ ترین اس افسانے پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتیں ہیں:

''اس کہانی میں اقتصادی صورتحال سے پیدا ہونے والی معاشرتی اونچ نیچ نے ایک عجیب تاثر پیدا کر دیا ہے جو ایک ہی وقت میں مضحکہ خیز بھی ہے اور المیہ بھی۔ معاشی صداقت پر مبنی اس افسانے میں اسلوب کا تیکھا پن اور فقروں کی کاٹ نے اس کا تاثر اور بڑھا دیا ہے۔''(۸)

شوکت نعیم قادری اس افسانے پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''عام طور پر کہا جاتا ہے کہ رومانوی ملمع کاری اور رچاؤ کے بغیر کہانی سے دلچسپی کا عنصر مفقود ہو جاتا ہے۔ ایسے لوگوں کو میں انوار احمد کی کہانی ''نوں جی'' پڑھنے کی دعوت دیتا ہوں جس میں شخصی بے حسی اور سماجی کرختگی کو انتہائی چابک دستی سے ہم آمیز کر دیا گیا ہے کہ زہر خند کی کی کیفیت نمودار ہو جاتی ہے۔''(۹)

انوار احمد ۱۹۹۵ء سے ۱۹۹۹ء تک انقرہ یونیورسٹی میں رہے۔ ترک معاشرے کا قریب سے مطالعہ کیا۔ ان کی نظریں بظاہر نظر آنے والی چکا چوند سے متاثر نہیں ہوتیں بلکہ اس رنگا رنگی میں حصہ لینے والے اداس لوگوں کی اداسی کا سبب جاننے میں سر گرداں رہتی ہیں۔ ترک معاشرے پر لکھی گئی کہانیوں میں سے ''انقرہ کے کوغلو پارک کی حکایت'' انفرادیت کی حامل ہے۔ یہ بیانیہ طرز کا افسانہ ہے جس میں مصنف نے ایک رنگا رنگ ترکی کو پیش کرنے کے بعد ایک واقعہ پیش کیا ہے اور نتائج اخذ کرنے کی ذمہ داری قاری کے کندھوں پر عائد کر دی ہے۔ اس افسانے میں انوار احمد نے لالے گل کے کردار کے ذریعے پاکستانی معاشرے کے تاریک گوشوں پر بھرپور انداز میں چوٹ کی ہے۔ انوار احمد کے افسانوں میں لمبی لمبی تقریروں کے بجائے بات کرتے کرتے ایک جملہ آتا ہے۔ جو ان تقریروں اور وعظ سے بڑھ کر اثر انگز ہوتا ہے۔ اسی طرح جب مصنف لالے گل سے اس کے محبوب کی بیماری کی نوعیت پوچھتا ہے تو وہ بتاتی ہے کہ اس کے ٹیسٹیز میں کینسر ہے اور جواب میں مصنف کے جملے پاکستان معاشرے کی تنگ نظری اور قدامت پسندی کا پردہ فاش کر دیتے ہیں:

''ہمارے ہاں تو میاں بیوی تک مرتے مر جاتے ہیں، اس طرح کی بیماریوں کا نام نہیں لیتے، جن میں بعض اعضا کی بے پردگی کا اندیشہ ہو تو وہ کہنے لگی مذہبی لوگوں کے ایسے اعضاء بیمار نہیں ہوتے۔''(۱۰)

انوار احمد اس ملک میں تمام مسائل کا حل تعلیم عام کرنے میں ڈھونڈتے ہیں۔ان کے نزدیک عام آدمی کے پاس معاشرے کے نامساعد حالات سے لڑنے کے لیے اس کے علاوہ کوئی اور ذریعہ نہیں ہے۔ایک عام انسان اسی کے ذریعے شعور کی منازل طے کرتا ہے۔آنے والی زندگی میں مشکلات اور تکالیف کے لیے خود کو تیار کرتا ہے۔ ہمارے ملک کے بیشتر مسائل محض اس لیے ہیں کہ ہماری شرح خواندگی بہت کم ہے۔ انوار احمد ترکی جا کر وہاں کی ترقی، روشنیوں اور زندگی کی جدت سے متاثر نہیں ہوئے بلکہ انھوں نے اس معاشرے کے محروم طبقے کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔انوار احمد نے دیارِ غیر میں بھی جب کہانی کی بنت کی ہے تو ان کے لاشعور میں پاکستان ہی موجود ہے۔وہ غیر ملکی کرداروں سے وطنِ عزیز کے تاریک پہلوؤں پر چوٹ کرتے ہیں۔انوار احمد کے افسانے وطنِ عزیز کو درپیش مسائل سے منسلک ہیں۔ڈاکٹر طاہرہ اقبال لکھتی ہیں:

> ''انوار احمد کی کہانی پاکستان کی خود احتسابی کی داستان ہے۔وہ نہ سیاستدان ہیں اور نہ ہی تاریخ دان لیکن ایک ادبی مورخ اور حساس ادیب کی روشنی طبع والی تمام بلائیں اور عذاب خود پر جھیل رہے ہیں۔اس لیے اس انحراف، بے انصافی، تفریق، استحصال کے خلاف احتجاج ان کے افسانوں کا خارجی چہرہ تو ہے ہی، داخلی سطح پر بھی انہی عوارض کے درد اور تکلیف سے کراہ رہی ہے۔''(۱۱)

'ناں گندے بچے ناں رونا نہیں' انوار احمد کا ایک اور موثر افسانہ ہے۔افسانے کا موضوع عصرِ حاضر میں تیزی سے پروان چڑھنے والی مذہبی شدت پسندی ہے۔نوجوانوں کو مذہب کے نام پر بیوقوف بنایا جاتا ہے اور ان کی برین واشنگ کی جاتی ہے۔اُنھیں جنت کے سہانے خواب دیکھا کر جہنم میں جھونک دیا جاتا ہے۔ جس سے بے شمار گھرانے متاثر ہوتے ہیں۔انوار احمد نے ہیروشیما کے موضوع کا ذکر قاری کے امید کے احساس کو زندہ رکھنے کے لیے کیا ہے۔اگر ایٹم بم کو برداشت کر کے ایک شہر پھر سے تعمیر ہو سکتا ہے تو پھر ہر شے نئے سرے سے تعمیر ہو سکتی ہے تاریکی کتنی ہی کیوں نہ بڑھ جائے اندھیرے کتنے ہی کیوں نہ پھیل جائیں روشنی کی ایک کرن ان کو ختم کرنے کے لیے کافی ہوتی ہے۔

اس افسانے میں انوار احمد نے اپنے نمائندہ انداز سے انحراف کیا ہے۔ یہ افسانہ ان کے دوسرے افسانوں کی نسبت طویل بھی ہے اور کردار بھی زیادہ استعمال کیے گئے ہیں۔ اسلوب بھی سادہ اور بیانیہ ہے۔ حالاں کہ انوار احمد کا اسلوب تیکھا، پہلودار اور الجھا ہوا ہوتا ہے۔ قاری کو موضوع کی تہہ تک پہنچنے کے لیے ذہنی ریاضت کرنی پڑتی ہے۔ پانڈے جی کا کردار ہندو ہے تو اس کے مکالموں میں بھی ہندی الفاظ ملتے ہیں جس سے افسانے کا تاثر بڑھتا ہے۔ مجموعی طور پر یہ افسانہ اپنے موضوع کے اعتبار سے انفرادیت کا حامل ہے۔

انوار احمد کی تخلیقی شخصیت پہچان کے عمل سے گزر ہی تھی کہ ملک میں مارشل لا لگ گیا لیکن سچائی کا اظہار تو ضروری تھا۔ لہٰذا انوار احمد نے اپنے اسلوب کو پیچیدہ، گنجلک، پر پیچ، کثیر المعانی اور علامتی بنا لیا کہ جس سے تزکیہ نفس بھی ہوتا رہے اور ابلاغ کا مسئلہ بھی درپیش نہ ہو۔ انوار احمد سادہ اور عام فہم علامتیں استعمال کرتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ افسانے میں تہہ داری اور پہلو داری کے باوجود افسانے کے حسن میں اضافہ ہوتا ہے۔ ڈاکٹر علی اطہر لکھتے ہیں:

> ''انوار احمد کی فکری جہت نے حقیقی تجربوں کو خالص تخلیقی شعور کے ارتقا کے ساتھ بیان کیا اور ان کی جملہ سازی اپنے تمام مفاہیم، اغراض و مقاصد اور سیاق و سباق کے ضمن میں مکمل یکتائی کی امین لگتی ہے۔''(۱۲)

انوار احمد فنی وسائل پر مکمل دسترس رکھتے ہیں اور ان کے بر محل استعمال کے ہنر سے واقف ہیں۔ ''نوں جی'' ان کا شاندار افسانہ ہے۔ اس افسانے میں انوار احمد کا اسلوب بھی بہت شاندار ہے۔ اگرچہ اس سے پہلے بھی انوار احمد اپنی تخلیقات میں، فنی وسائل پر اپنی گرفت کا اظہار کر چکے ہیں۔ مگر اس افسانے میں یہ ہنر اپنے عروج پر نظر آتا ہے۔ رکشہ ڈرائیور جب اپنی داستان سنا رہا ہوتا ہے تو اچانک ایک راہ گیر اس کے رکشے کے سامنے آجاتا ہے تو وہ اسے مغلظات سے نوازتا ہے۔ انوار احمد نے اسی بات کو اتنے دلفریب رنگ میں بیان کیا ہے کہ قاری افسانے کے موضوع کو بھول کر انوار احمد کے فنی محاسن کی داد دینے لگتا ہے۔ اقتباس دیکھیے:

> ''ایک دم رکشے کے بریک چیخے اور وہ اس راہ گیر کی ماں بہن کو با آوازِ بلند شرم ناک خواہشات کے ساتھ یاد کرنے لگا۔''(۱۳)

طنز کو انوار احمد کے اسلوب میں بنیادی حیثیت حاصل ہے۔اُنھوں نے اپنے طنزیہ جملوں کا نشانہ ہر اس ادارے کو بنایا ہے جو اپنے فرائض کو پسِ پشت ڈال کر اس ملک کی تاریکی میں اپنا حصہ ڈال رہا ہے۔ وہ چاہے تعلیم کے سوداگر ہوں، مذہب کو بیچنے والے ہوں، معاشی استحصال کرنے والے ہوں، مزدور کے منہ سے روٹی کا نوالہ چھیننے والے ہوں، مزاحمت کا خواب دکھا کر خود محفوظ راستہ اپنانے والے ہوں، جمہوریت کی بساط لپٹنے والے ہوں یا پورے ملک کو اپنے طرزِ فکر کے مطابق سوچنے پر مجبور کرنے والے ہوں، انوار احمد نے ان تمام طبقوں کو مخصوص انداز میں تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ان کے نزدیک تعلیم بنیادی اہمیت کی حامل ہے۔ طبقاتی تقسیم، عدم مساوات، معاشرتی جبر اور استحصال سے مزین اس معاشرے میں عام لوگوں کے پاس تعلیم ہی وہ راستہ ہے جس کے ذریعے وہ اپنی تاریکی کو روشنی میں بدل سکتے ہیں مگر جب تعلیمی اداروں میں علم کی روشنی بانٹنے والے خود روشنی سے محروم ہوں تو معاشرے میں انحطاط مستقل طور پر ڈیرے ڈال لیتا ہے۔انوار احمد معاشرے کے جملہ طبقات کا سواگت اپنے کاٹ دار جملوں سے کرتے ہیں، جو منافقت کا لبادہ اوڑھ کر اعلیٰ مسند پر براجمان ہیں:

> ''اس علاقے میں تین طرح کے لوگ رہتے تھے۔ناخواندگی کے ضامن یعنی محکمہ تعلیم سے وابستہ تنخواہ دار بھوت، طاقتور حلقوں کی عنایت سے سمگلنگ اور جعلی ادویات کی بدولت کشادہ ہو جانے والے رزق پر پلنے والے قانون ساز رسہ گیر، وہ زراعت پیشہ جن کی ازلی طور پر دو قسمیں تھیں۔ایک جو گرمی، سردی، زمین پر محنت کرتے مگر صلے میں اپنی تذلیل اور بے بسی میں اضافہ کرتے، دوسرے وہ جوان کی محنت کی ہر فصل پر ایک نئی شادی، ایک نئے مقدمے اور ایک نئی کونسل کے ممبر بننے کے جتن میں مبتلا ہوتے۔''(۱۴)

انوار احمد مزدور اور سرمایہ دار کے مابین جنگ میں سرمایہ دار پر شدید طنز کرتے ہیں۔مزدور جو موسم کی شدت سے بے پرواہ ہو کر محنت کرتا ہے مگر اس محنت کے بدلے میں اس کی ظلمت اور بے بسی میں مزید اضافہ ہوتا ہے اور انگریزوں کی نوازی ہوئی زمین پر جاگیر دار مالک بن کر بیٹھتا ہے اور بنا کسی محنت اور جدوجہد کے تمام فصل اٹھا لیتا ہے۔انوار احمد کو دکھ تو اسی بات کا ہے کہ جن طبقات کو قانون کی حفاظت کے لیے مامور کیا جاتا ہے وہ ہی اس کو آہستہ آہستہ زہر دے رہے ہیں۔ وہ لوگ جن کی ذمہ داری شرح خواندگی کو سو فیصد کرنا ہے، وہ اس

ملک کی ناخواندگی کی شرح کو بڑھانے کے لیے اپنا تن، من، دھن قربان کر رہے ہیں اور ان مقتدر طبقوں کی گٹھ جوڑ ایسی سازشیں کرتی ہے کہ غریب اور معصوم عوام کو ان سے نکلنا نصیب ہی نہیں ہوتا۔ انوار احمد اپنے افسانے میں معاشرے کا استحصال کرنے والے طبقوں کے خلاف واضح انداز میں بات کرتے ہیں۔ انوار احمد اپنے نشانے سے ہمیشہ باخبر ہوتے ہیں اور اس پر تیر چلاتے ہیں۔ بقول اصغر ندیم سید:

> ''انوار احمد کی انفرادیت یہی ہے کہ وہ مبہم نشان پر تیر نہیں چلاتا۔ ہدف اس کے حافظے میں جیتا جاگتا ہے۔ اس کا مخاطب بھی نامعلوم نہیں ہے، جانا پہچانا ہے۔ اس کی خود کلامی اپنے آپ سے نہیں، بے شمار لوگوں سے ہے۔''(۱۵)

انوار احمد نے اپنے افسانوں میں ملا کے کردار کو بھی بے نقاب کیا ہے کیوں کہ انوار احمد کے نزدیک جو مارشل لا پاکستان میں تمام شخصی حکومتوں سے بدترین تھا، اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ اس آمر نے مذہبی ریاکاری کو فروغ دیا۔ مذہب بیچنے اور اس کے نام پر استحصال کرنے والے مولوی پیدا کیے، جنھوں نے رجسٹروں پر حاضری لگوا کر نمازیں پڑھنے کا طریقہ ایجاد کیا۔ انوار احمد نے اپنے افسانوں میں ایسے مذہبی ملا کو بھی بے نقاب کیا ہے جو حرص اور ہوس کے تابع ہو کر کسی بھی قسم کے حالات میں کسی بھی قسم کا فتوی دے سکتا ہے۔ وہ ملا جس کو طاقتور ہمیشہ سے محکوم اور کمزور طبقے کو دبانے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ وہ ملا جو مذہب کا نام لے لے کر غریب عوام کو مزید غریب ہونے کا گر بتاتا ہے۔ انوار احمد کے افسانے میں ملا کے کردار کے مکالمے دیکھئے جس میں وہ مقتدر اور حاکم طبقے کے ظلم و ستم پر پردہ ڈال کر غریبوں کو صبر کی تلقین کرتا ہے اور سوال کرنے سے منع کرتا ہے:

> ''عزیزو! مشیت ایزدی کے روبرو سر تسلیم خم کرنا شانِ عبودیت ہے۔ یہ مقام آزمائش کا ہے جہاں نیک اور صابر ہی سرخرو ہوتے ہیں اور اس کی منشا کے عین مطابق ہونے والے وقوعے کو امر ربی جان کر چون وچرا نہیں کرتے۔ درمیان میں بین کرتی عورت نے میاں صاحب کی کھیتوں کا ذکر اونچے سروں میں کیا تو مولوی صاحب نے لاحول پڑھنے کے بعد دوزخیوں کی بڑی نشانی سوال کرنا اور وسوسہ ڈالنا قرار دیا۔''(۱۶)

مذہب کو سستے داموں بیچ کر اعلیٰ مسند حاصل کرنے والا مولوی انوار احمد کے افسانوں کا اہم موضوع رہا ہے۔اس افسانے کے آخر میں بھی انوار احمد نے مولوی کے نام نہاد کردار کو پیش کیا ہے جو بے عملی کا درس دیتا ہے۔ جو صبر کے نام پر انسان کو کوشش کرنے سے روکتا ہے۔ جو سوچنے، سمجھنے پر کفر کے فتوے لگاتا ہے۔ جو مقتدر طبقے کے سامنے سر جھکانے کو عین شانِ عبوریت خیال کرتا ہے۔ اس کی تقریروں میں ناصح موجود ہے، مبلغ موجود ہے جو اپنے پر شکوہ الفاظ سے عوام کو مسخر کرتا ہے:

> ''اے ایمان والو! قضا اور قدر کے کھیل نرالے ہیں، یہ زمین، آسمان، خشکی، تری، دھوپ اور سایہ اور ان میں لپٹا ہوا انسان اور انسانی عمل مشیت ایزدی اور رضائے الٰہی کے تابع ہے، ممکن ہے کہ ابھی تم سب کو اور آزمایا جائے، یاد رکھو مومن کی یہی نشانی ہے کہ وہ منشاتے ربانی کے روبرو سر بسجود ہو جائے اور تحقیق، عزت، ذلت، حیات اور موت منجانب اللہ ہیں، ہمارا کام توبہ واستغفار ہے۔''(۱۷)

انوار احمد کے افسانوی دور کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا دور ۱۹۷۱ء سے شروع ہو کر ۱۹۹۰ء تک اور دوسرا دور ۱۹۹۰ء کے بعد لکھنے جانے والے افسانوں پر مشتمل ہے۔ پہلے دور میں انوار احمد کے موضوعات پاکستانی معاشرے سے لیے گئے ہیں۔ جب کہ دوسرے دور میں اُنھوں نے ترکی اور جاپان کے بارے میں بھی کہانیاں لکھی ہیں۔ ترک معاشرے پر لکھی گئی کہانیوں میں انوار احمد نے پاکستانی حکام کی بے حسی، ہر طرح کے حالات سے سمجھوتا کرنے اور بظاہر روشن اور چمکدار نظر آنے والے معاشروں میں افراد کی غربت کو موضوع بنایا ہے۔ جاپان میں لکھے جانے والے افسانوں کے موضوع مذہبی شدت پسندی اور ترقی یافتہ معاشروں میں فرد کی تنہائی اور مشکلات ہیں۔ انوار احمد کے موضوعات میں تنوع ہے۔ اُنھوں نے مختلف موضوعات پر قلم اٹھایا ہے اور مختلف فنی وسائل کو برت کر قاری کے سامنے پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر قاضی عابد لکھتے ہیں:

> ''ان کی افسانہ نگاری کو واضح طور پر دو ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلے دور (۱۹۷۰ء تا ۱۹۹۰ء) میں اُنھوں نے ترقی پسندی کی فکری روایت سے ہم رشتہ ہونے ہوئے بھی

جدیدیت کے فنی وسائل علامت، سرریئلزم اور کہیں کہیں تجرید کو بھی بے پناہ تخلیقی وفور کے ساتھ استعمال کیا ہے جب کہ دوسرے دور (مابعد ۱۹۹۰ء) میں اُنھوں نے حقیقت پسندی کے ساتھ ساتھ مابعد جدیدیت کے فنی امکانات کو بھی اپنی کہانیوں میں بخوبی برتا ہے۔''(۱۸)

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انوار احمد باکمال افسانہ نگار ہیں۔ افسانے کے فن سے مکمل آگہی رکھتے ہیں، اس کی باریکیوں سے واقف ہیں۔ مگر اس کے باوجود انوار احمد نے اتنا کم کیوں لکھا۔ اس سوال کا جواب وہ اپنے انٹرویو میں یوں دیتے ہیں:

''جب آپ نے بہت اچھا افسانہ پڑھا ہوتا ہے تو آپ کو پتہ ہوتا ہے کہ یہ چند نامور لوگ ہیں۔ ان سے بہتر لکھنا تو ایک طرف ان کے برابر آنے کے لیے غیر معمولی صلاحیت درکار ہے۔''(۱۹)

انوار احمد افسانے کے نامور ناقد ہیں۔ ایک ایسے ادیب کہ جن کو افسانہ پڑھنے، لکھنے، سمجھنے اور اس کے بارے میں سوچنے سے عشق ہے۔ کوئی بھی افسانہ نگار ایسا نہیں ہے جس کے بارے میں انوار احمد نے نہ پڑھا ہو۔ جب آپ اعلیٰ پائے کے افسانے پڑھ لیتے ہیں تو پھر آپ کو ادراک ہوتا ہے کہ اس مقام تک پہنچنا کتنا مشکل ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہم کہ سکتے ہیں کہ انوار احمد کے اندر کے نقاد نے اُنھیں بطور افسانہ نگار بہت زیادہ لکھنے سے باز رکھا۔ انوار احمد کے چند بیانیہ افسانوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اگر ہم دیکھیں تو انوار احمد کا اسلوب علامتی ہے۔ اردو افسانے کی دنیا میں علامت کے درآنے سے ابلاغ نے بھی سر اٹھانا شروع کیا۔ لیکن ان کے افسانوں میں ابلاغ کے مسائل سے دوچار نہیں ہونا پڑتا۔ انوار احمد علامتی افسانہ بھی لکھیں، لیکن قصے پن کا عنصر ان کے افسانوں میں موجود ہوتا ہے جو قاری کی دلچسپی کو بھٹکنے نہیں دیتا۔ افسانے کے حوالے سے انوار احمد کا نظریہ فن ملاحظہ کیجیے:

''میں ان مصنفوں کو پسند کرتا ہوں جو ہر بات کی تشریح نہ کریں۔ اگر وہ افسانے میں بھی الف سے لے کر یے تک سب کچھ بتائیں تو میں اس کو ناپسند کرتا ہوں۔ میرے نزدیک

کاوش وہ ہے جو قاری کو ذہنی شراکت کی ترغیب دے۔ایک مرتبہ آپ اس کو سمجھ لیں تو آپ اس سے لطف اندوز ہوتے رہتے ہیں۔''(۲۰)

انوار احمد ترقی پسند تحریک کی فکری روایت کا تسلسل ہیں۔اُنھوں نے اپنے افسانوں میں اس کا بر ملا اظہار کیا ہے۔انوار احمد کسی بھی سطح پر استحصال، ظلم، جبر اور استبداد کے خلاف ہیں، جب وہ ان انسانوں کے دکھ درد کا مداوا نہیں کر سکتے تو وہ کہانی لکھنے بیٹھ جاتے ہیں اور سارا دکھ سمٹ کر آن کی کہانی میں آ جاتا ہے۔انوار احمد افسانے کی روایت میں گراں قدر اضافہ ہیں۔ڈاکٹر روبینہ ترین نے نہایت مختصر اور دلکش انداز میں انوار احمد کے افسانوں کا مجموعی جائزہ لیا ہے۔ لکھتی ہیں:

''انوار احمد کے ارد گرد سے ہی مختلف موضوعات اور کردار ان کی کہانیوں میں تحلیل ہو کر جذبوں میں طوفان برپا کرتے ہیں۔روح کی گہرائیوں میں اتر جانے والا فقرہ انوار احمد کا خاصا ہے، اور اسی انداز نے ان کی تحریروں میں اختصار اور اشاراتی انداز بھر دیا ہے۔کوئی بھی افسانہ خواہ علامتی ہو، بیانیہ یا شعور کی رو پر لکھا گیا، قصہ پن کی خصوصیت اس میں ضرور موجود ہوتی ہے۔جو کہیں بھی قاری کا تجسس اور دلچسپی ختم نہیں ہونے دیتی۔ انوار احمد کی فنی ریاضت نے اُنھیں اردو افسانے کی روایت میں ایک نمایاں اور بلند مرتبے پر فائز کر دیا ہے اور یہ ان کا استحقاق بھی ہے۔''(۲۱)

حوالہ جات:

۱۔ آسیہ رانی، میرا زاویہ، (ملتان: سخن ور فورم، ۲۰۰۹ء)، ص ۴۷۔

۲۔ مقالہ نگار کا ڈاکٹر انوار احمد سے انٹرویو، بتاریخ ۲۲ اگست ۲۰۱۲ء۔

۳۔ مقالہ نگار کا ڈاکٹر اے۔بی۔اشرف سے انٹرویو، بتاریخ ۸ جون ۲۰۱۳ء۔

۴۔ انوار احمد، ڈاکٹر، آخری خط، (فیصل آباد: مثال پبلشرز، ۲۰۱۰ء)، ص ۳۵۔

۵۔ ایضاً، ص ۲۳۔

۶۔ اصغر ندیم سید، ''کہانی کار اور کہانی کی کہانی''، مشمولہ: پہلے سے سنی ہوئی کہانی، (ملتان: بیکن بکس، ۲۰۰۳ء)، ص ۲۰۔

۷۔ انوار احمد، ڈاکٹر، آخری خط، ص۱۸۔

۸۔ روبینہ ترین، ڈاکٹر، تاریخ ادبیات ملتان، (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۱۲ء)، ص۳۱۰۔

۹۔ شوکت نعیم قادری، نتائج فکر، (ملتان: بہاءُالدین زکریا یونی ورسٹی، ۲۰۰۴ء)، ص۱۱۴۔

۱۰۔ انوار احمد، ڈاکٹر، آخری خط، ص۱۳۶۔

۱۱۔ طاہرہ اقبال، ڈاکٹر، ''انوار احمد کی افسانوی جہات''، مشمولہ: اوراقِ تحقیق، (فیصل آباد: شعبہ اردو گورنمنٹ کالج وویمن یونیورسٹی، ۲۰۱۶ء)، جلد ا، شمارہ ا، ص۸۷۔

۱۲۔ علی اطہر، ڈاکٹر، ''انوار احمد کے افسانوں میں سماجی حقیقت نگاری''، مشمولہ: پیلھوں، (ملتان: پیلھوں پبلی کیشنز، ۲۰۱۹ء)، ستمبر تا دسمبر، شمارہ۲۶، ص۱۰۴۔

۱۳۔ انوار احمد، ڈاکٹر، آخری خط، ص۱۸۔

۱۴۔ ایضاً، ص۸۶۔

۱۵۔ اصغر ندیم سید، ''کہانی کار اور کہانی کی کہانی''، مشمولہ: پہلے سے سنی ہوئی کہانی، ص۱۹۔

۱۶۔ انوار احمد، ڈاکٹر، آخری خط، ص۹۵۔

۱۷۔ ایضاً، ۳۰۔

۱۸۔ قاضی عابد، ڈاکٹر، ''فلیپ''، مشمولہ: آخری خط، (فیصل آباد: مثال پبلشرز، ۲۰۱۰ء)۔

۱۹۔ مقالہ نگار کا ڈاکٹر انوار احمد سے انٹرویو، بتاریخ ۲۲ اگست ۲۰۱۲ء۔

۲۰۔ ایضاً۔

۲۱۔ روبینہ ترین، ڈاکٹر، تاریخ ادبیات ملتان، ص۳۱۲۔